سورۃ البقرۃ

آیات ۶۹ ۔ ۷۱

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ بحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۴۴ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا ۚ
قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ ۙ فَاقِعٌ
لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِينَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ
عَلَيْنَا ؕ وَإِنَّا إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُونَ ○
قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ
الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

فِيهَا ۚ قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ○

۲:۴۴:۱ اللغة

[قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا] اس پوری عبارت کے الفاظ کی لغوی اور اعرابی تشریح و ترجمہ وغیرہ اس سے پہلے (بسلسلہ آیت ۶۸ قطعہ سابقہ) زیر بحث آ چکے ہیں دیکھئے [۲:۴۳:۱(۵-۶)] اور [۲:۴۳:۲] (الاعراب) میں ۲ یہاں ہم دوبارہ اس کا صرف ترکیبی لفظی ترجمہ لکھ دیتے ہیں" انہوں نے کہا تو پکار اپنے رب کو ہمارے لیے (کہ) وہ واضح کر دے ہمارے لیے" اس کے مختلف بامحاورہ تراجم پر سابقہ قطعہ میں مفصل بات ہو چکی ہے (حصہ اللغۃ میں)

۲:۴۴:۱(۱) [مَا لَوْنُهَا] اس میں "مَا" تو استفہامیہ (بمعنی کیا ہے) ہے اور "لَوْنُهَا" مرکب اضافی (لون + ها) ہے جس میں ضمیر مجرور "ها" بمعنی "اس کا" ہے۔ "لَوْنٌ" کا مادہ "ل و ن" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد استعمال نہیں ہوتا۔ البتہ مزید فیہ کے ابواب تفعیل اور تفعل سے افعال (بمعنی رنگ دینا۔ رنگ بدلنا وغیرہ) استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی صیغہ فعل کہیں نہیں آیا۔ بلکہ اس مادہ سے ماخوذ صرف یہی لفظ (لَوْن) مفرد یا مرکب صورت میں دو جگہ آیا ہے

اور اسی کی جمع مکسر "اَلْوَان" بھی (مفرد یا مرکب شکل میں) کل سات جگہ آئی ہے۔

● زیر مطالعہ کلمہ "لَوْنٌ" کے بنیادی معنی "رنگ" ہیں۔ پھر بطور استعارہ یہ لفظ "نوع" اور "قسم" وغیرہ کے معنی بھی دیتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ ہر جگہ اپنے بنیادی معنی (رنگ یا رنگوں) کے لیے ہی استعمال ہوا ہے۔ یہاں (زیر مطالعہ جملہ میں) "مَا لَوْنُهَا" کا ترجمہ "اس کا رنگ کیا ہے؟" بنتا ہے۔ یہاں پھر "لون" کے مضاف الیہ کے طور پر ضمیر مؤنث "ها" کا آنا "بقرۃ" کے "گائے" والے ترجمہ کی تائید کرتا ہے (اوپر "بقرۃ" کا ترجمہ "گائے" یا "بیل" کی بات ہوئی تھی)

[قَالَ اِنَّهُ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ] ٹھیک یہی عبارت اوپر (قطعہ سابقہ میں) بسلسلہ آیت ۶۸ زیر بحث آ چکی ہے۔ اگر ضرورت ہو تو دیکھئے [۲:۴۳:۱(۶)] کے بعد نیز [۲:۴۳:۲] (الاعراب) میں ۵

۲:۴۴:۱(۲) [صَفْرَاءُ] اس کا مادہ "ص ف ر" اور وزن "فَعْلَاءُ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

مختلف ابواب سے مختلف معانی کے لیے آتا ہے مثلاً (باب ضرب سے) "صَفَرَ یَصفِرُ صفیرًا" کے معنی ہیں "ہونٹوں اور منہ سے سیٹی بجانا" اور (باب سمع سے) "صَفِرَ یَصفَرُ صَفَرًا" کے (ایک) معنی ہیں "خالی ہونا" مثلاً کہتے ہیں "صَفِرَ الإِناءُ" (برتن خالی ہوگیا) اور اس مادہ سے مزید فیہ کے بعض ابواب سے بھی مختلف معانی کے لیے فعل استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے مجرد یا مزید فیہ کا کوئی صیغۂ فعل کہیں نہیں آیا۔ البتہ فعل مجرد سے مشتق اسم صفت (برائے الوان و عیوب) کے دو صیغے دو جگہ اور مزید فیہ کے باب "اِفْعِلَال" سے اسم الفاعل (کا ایک ہی صیغہ) تین جگہ آئے ہیں۔ ان پر حسبِ موقع بات ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ "صفراءُ" اس مادہ سے "افعل الوان و عیوب" (اسم صفت) کا صیغہ برائے مؤنث ہے۔ یعنی اس سے مذکر کے لیے "اَصْفَرُ" اور مؤنث کے لیے لفظ "صَفراءُ" آتا ہے اور دونوں کی جمع "صُفْرٌ" آتی ہے (خیال رہے دونوں واحد (مذکر مؤنث) غیر منصرف اور دونوں کی جمع معرب ہوتی ہے اور یہ صیغۂ جمع "صُفر" بھی قرآن میں آیا ہے)۔ اور ان کے معنی ہیں "زرد رنگ والا/ والی/ والے" یا صرف "زرد"۔ اور یہ "زرد رنگ" والا مفہوم اس مادہ کے فعل مجرد میں نہیں بلکہ مزید فیہ کے باب "اِفعلال" میں ہوتا ہے کہتے ہیں "اِصفَرَّ یَصفَرُّ اِصفِرارًا" (زرد ہو جانا)۔ اس طرح "صَفراء" کے معنی ہیں "زرد رنگ والی" یا صرف "زرد"۔ یہاں اس صفت برائے مؤنث کا گائے کے لیے آنا بھی "گائے" (بجائے بیل) والے ترجمہ کی تائید کرتا ہے۔

<u>۲:۴۴:۱(۳)</u> [فَاقِعٌ لَوْنُهَا] اس کے دوسرے حصے (لونھا = اس کا رنگ) کے معنی وغیرہ پر ابھی اوپر [۲:۴۴:۱(۱)] میں بات ہوئی ہے۔

"فَاقِعٌ" کا مادہ "ف ق ع" اور وزن "فاعِلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "فَقِعَ یَفقَعُ فُقُوعًا (فتح، نصر اور سمع سے) بمعنی "رنگ کا گہرا یا شوخ زرد ہونا" آتا ہے۔ اس کا فاعل ہمیشہ "لَوْن" ہی ہوتا ہے کہتے ہیں: "فَقِعَ لونُہ" (اس کا رنگ شوخ یا خالص زرد تھا)۔ عربی زبان میں اس مادہ سے مزید فیہ کے بعض ابواب (تفعیل، تفاعل، اِفعال وغیرہ) سے بھی اَفعال مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل کہیں نہیں آیا۔ بلکہ صرف یہی ایک لفظ (فاقع) اسی ایک جگہ وارد ہوا ہے۔

● "فاقع" اس فعل مجرد سے صیغہ اسم الفاعل ہے جس کے معنی "گہرا، خالص اور شوخ ہونے والا (رنگ)" ہیں۔ یہ زیادہ تر زرد رنگ کے خالص (بغیر کسی دوسرے رنگ کی آمیزش کے) اور شوخ

© rasailojaraid.c

ہونے کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی بھی رنگ کے شوخ یا خالص ہونے کے لیے (بطور صفت) استعمال ہو سکتا ہے۔ تاہم اس کا خاص استعمال "زرد رنگ" کے لیے ہے مثلاً کہتے ہیں "اصفرُ فاقِعٌ" (شوخ یا خالص زرد رنگ کا)۔ اسی طرح مختلف رنگوں میں شوخی اور عدم آمیزش کو ظاہر کرنے کے لیے کچھ مخصوص (صفاتی) لفظ ہیں مثلاً کہتے ہیں "اسودُ حالِكٌ" (گہرے کالے رنگ والا) "احمرُ قانِئٌ" (سوخ اور خالص سرخ رنگ والا) "ابیضُ ناصِعٌ" (خالص اور نمایاں سفید رنگ والا) اور "اخضرُ ناضِرٌ" (شوخ اور چمکدار سبز رنگ والا) وغیرہ۔

● "فاقِعٌ لونُها" میں "فاقع" گائے کے لیے نہیں بلکہ رنگ کے لیے ہے یعنی "شوخ ہے رنگ اس کا"۔ لفظ "فاقع" کے اسی شوخی والے مفہوم کو اردو مترجمین نے "تیز زرد، خوب گہرا، ڈہڈہا رنگ، ڈہڈہا، ڈہڈہاتی رنگت، ڈہڈہاتے رنگ کی" سے ظاہر کیا ہے جو غالباً خالص ہندوستانی (اردو) محاورہ ہے۔ بعض حضرات نے صرف "زرد رنگ کی" پر گزارہ کر لیا ہے جس میں وہ "شوخ، گہرا اور نمایاں" ہے تو [illegible] مفقود ہے۔ یہاں بھی "لونُها" (اس کا رنگ) میں ضمیر مجرور مونث (ھا) کا آنا "بقرة" کے "گائے" والے معنی کی تائید کرتا ہے۔ اس عبارت پر مزید بات "الاعراب" میں بھی ہو گی۔

۲:۴۴:۱(۴) [تَسُرُّ] کا مادہ "س ر ر" اور وزن اصلی "تَفعُلُ" ہے۔ جو دراصل "تَسْرُرُ" تھا۔ پھر "ر" کی حرکت ساکن ماقبل (س) کو دے کر "ر" کو مدغم کر دیا گیا۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "سرّ ..... يَسُرُّ سُرُورًا / مَسَرَّةً" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے ایک معنی ہیں "..... کو خوش کرنا"۔ یہ فعل بعض دوسرے مصادر کے ساتھ بعض دیگر معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مگر وہ استعمال قرآن کریم میں نہیں آئے۔ یہ فعل متعدی ہے اور مفعول بنفسہ کے ساتھ آتا ہے۔ مجرد سے ان معنی (خوش کرنا) کے لیے یہ صیغہ فعل صرف اسی ایک جگہ (البقرہ: ۶۹) آیا ہے یہی فعل بصیغہ مجہول (سُرَّ يُسَرُّ سُرُورًا) بمعنی "خوش ہونا" استعمال ہوتا ہے اور اس معنی کے لیے یہ فعل عربی زبان کے ان چند افعال میں سے ایک ہے جو زیادہ تر بصیغہ مجہول ہی استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس سے کوئی مجہول صیغہ فعل تو کہیں نہیں آیا۔ البتہ اسم المفعول "مسرور" دو جگہ (الانشقاق: ۹، ۱۱) اور مصدر "سرور" ایک جگہ (الدھر: ۱۱) آیا ہے۔ اس مادہ سے مزید فیہ کے باب افعال سے ایک دوسرے معنی (چھپالینا) کے لیے متعدد صیغہ ہائے فعل ۱۸ جگہ اور دیگر مصادر اور بعض ماخوذ کلمات بھی بیس کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔ ان سب پر حسب موقع بات ہو گی۔

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

اِن شاء اللہ تعالےٰ۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "تَسُرُّ" اس فعل مجرد (بمعنی خوش کرنا) سے فعل مضارع معروف کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ یعنی "وہ خوش کرتی ہے" اور اسی کا بامحاورہ مصدری ترجمہ "خوش آنا، خوشی دینا، فرحت بخش ہونا، بھلی لگنا، دل خوش کر دینا، اچھی معلوم ہونا" سے بصیغۂ مؤنث یا مذکر (بیل کے لیے) کیا گیا ہے۔ تاہم یہاں بھی فعل کا بصیغۂ تانیث آنا (بیل کی بجائے) گائے والے معنی کی ہی تائید کرتا ہے اور اس کا بصیغۂ مذکر ترجمہ کرنا (مثلاً "خوش کر دیتا ہے") کسی طرح درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر نے تو بصیغۂ مؤنث ہی ترجمہ کیا ہے یا پھر بلحاظ جنس گول مول ترجمہ (مثلاً "کو فرحت بخش ہو") کر دیا ہے۔

۲:۴۴:۱(۵) [النّٰظِرِیْنَ] یہ لفظ یہاں سمجھانے کے لیے برسم املائی لکھا گیا ہے۔ اس کے رسم قرآنی پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی۔ اس لفظ کا مادہ "ن ظ ر" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فاعلین" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "نظَر... ینظُر نَظَرًا" (نصر سے) "صلہ" کے بغیر اور مختلف صلات کے ساتھ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱)... کو دیکھنا (۲)... کی طرف غور سے دیکھنا (۳)... میں غور و فکر کرنا اور (۴)... کا انتظار کرنا" وغیرہ۔ یہ قرآن میں کثیر الاستعمال فعل ہے۔ اس کے مختلف معانی و استعمالات پر البقرہ: ۵۰ [۲:۳۲:۱(۱۴)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

● زیرِ مطالعہ کلمہ "ناظرین" اس فعل مجرد سے صیغہ اسم الفاعل (ناظرٌ) سے جمع مذکر سالم ہے۔ "ناظر" کے معنی ہیں: "دیکھنے والا" اور اس کا ترجمہ قریباً سب نے "دیکھنے والوں" ہی کیا ہے۔ ایک مترجم نے "ناظرین" ہی رہنے دیا ہے اس لیے کہ یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ اگرچہ اس کا اردو استعمال بلحاظ مفہوم عربی سے قدرے مختلف ہے۔

[قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ] اس پوری عبارت کی وضاحت اوپر البقرہ: ۶۸ میں [۲:۴۳:۱(۵)] کے بعد اور [۲:۴۳:۱(۶)] میں کی جا چکی ہے جس میں مختلف تراجم بھی آ گئے ہیں۔

[اِنَّ الْبَقَرَ] "اِنَّ" کا ترجمہ "بے شک" ہے اور لفظ "البقر" یہاں بطور اسم جنس آیا ہے جس کا ترجمہ "سب گائے بیل" ہو سکتا ہے دیکھئے اوپر لفظ "بقرۃ" پر بحث [۲:۴۳:۱(۲)] میں۔

● "ذبح بقرۃ" کے اس قصے میں صرف یہی ایک ایسا لفظ (آیا) ہے جو گائے کے علاوہ بیل کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ ("بقرۃ" کا ترجمہ "بیل" کرنے کی بات بھی اوپر البقرہ: ۶۷ [۲:۴۳:۱(۲)] میں ہو چکی ہے)۔ اگرچہ یہاں (زیر مطالعہ عبارت میں) بھی لفظ "البقر" گائے بیل دونوں کے لیے

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

بطور جنس ہے اور اس کے معنی لازماً "بیل" ہی نہیں ہو سکتے بلکہ ترجمہ "گائے" بھی ہو سکتا ہے جس کی تائید مختلف صیغہ ہائے فعل اور ضمائر کے استعمال سے ہوتی ہے جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کرتے آئے ہیں۔ نیز یہ کہ "البقر" کا ترجمہ گائے یا بیل بطور مفرد (واحد) نہیں ہو سکتا بلکہ اسم جنس ہونے کی بنا پر اس کا ترجمہ "ساری گائیں" یا "سارے بیل" یا "سب گائیں اور سب بیل" ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس عبارت (اِنَّ البقرَ) کا ترجمہ اگلے آنے والے فعل (تشابہ علینا) کے ساتھ مل کر (مجموعی ترجمہ) ہی بہتر ہوگا۔

۲:۴۴:۱(۶) [تَشَابَهَ عَلَيْنَا] آخری مرکب جاری (علینا) کا ترجمہ تو ہے "ہم پر"۔ اور ابتدائی لفظ "تَشَابَهَ" (جس کے رسم قرآنی پر آگے بات ہوگی) کا مادہ "ش ب ہ" اور وزن "تَفَاعَلَ" ہے یعنی یہ اس مادہ سے مزید فیہ کے باب تفاعل کا فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد تو استعمال ہی نہیں ہوتا۔ اور اس سے باب تفاعل کے فعل "تشابہ یتشابہ" کے معنی وغیرہ پر البقرہ: ۲۵ [۲:۱۸:۱(۸)] میں بحث ہو چکی ہے۔

● "تَشَابُهٌ" کے معنی ہیں "دو چیزوں کا باہم ملتا جلتا ہونا کہ جس سے پہچان میں التباس (شک) پیدا ہو"۔ اس فعل کے فاعل ہمیشہ دو (تثنیہ) یا دو سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کا فاعل ایک نہیں ہو سکتا۔ "تشابہ الرجلُ" (آدمی ملتا جلتا ہوا) کہنا غلط ہے۔ کہیں گے "تشابہ الرجلان" یا "تشابہ الرجالُ" (یعنی دو یا سب مرد باہم ملتے جلتے تھے)۔ اس فعل کی یہ خصوصیت (جسے مشارکت کہتے ہیں) بھی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں "البقرہ" کے معنی کم از کم دو یا پھر "سب گائے بیل" ہی ہو سکتے ہیں۔ یعنی سب گائیں اور بیل باہم ملتے جلتے ہیں۔

● یوں اس پوری عبارت "اِن البقر تشابہ علینا" کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "بے شک سب گائے بیل باہم ملتے جلتے ہو گئے ہمارے اوپر"۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مترجمین نے یہاں "البقر" کا ترجمہ جو بھی کیا ہے جمع سے کیا ہے یعنی "بہت سے بیل" یا "گایوں" یا "بہتیری گائیں" کی صورت میں۔ بعض نے بصورت واحد "اس بیل" یا "اس گائے" سے ترجمہ کیا ہے۔ لام عہد سمجھ لینے سے اس کا ترجمہ "اس" کے ساتھ ہو تو سکتا ہے مگر "البقر" کا ترجمہ واحد سے کرنا درست نہیں ہے۔ "البقرۃ" ہوتا تو بھی بات بن جاتی۔ "تشابہ علینا" کا بامحاورہ ترجمہ بعض نے "شبہ" اور "اشتباہ" کے لفظوں سے ہی کیا ہے جن کا تعلق اسی مادہ سے ہے اور اردو میں مستعمل ہیں یعنی "ہم کو اشتباہ ہوا، قدرے اشتباہ ہوا، ہم کو (گایوں۔ گائے۔ بیل) میں شبہ پڑا یا پڑ گیا" کی صورت میں بعض حضرات نے اردو محاورے

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

پر زیادہ زور دیتے ہوئے اس عبارت کا ترجمہ "ہم کو تو (سب گائیں۔ سب بیل یا سب بیل اور گائیں) ایک دوسرے کے مشابہ/ باہم ملتے جلتے/ سب ایک ہی طرح کے/ ایک جیسے لگتے/ دکھائی دیتے ہیں"۔ ان ترجموں میں جمع کا صیغہ فعل "تشابہ" میں مشارکت کی خصوصیت اور "البقر" کے اسم جنس ہونے کی بنا پر ہی اختیار کیا گیا ہے۔

[وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ] اس جملہ کے تمام اجزاء کے معنی وغیرہ اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اگر چاہیں تو "وَ" (اور) کی بحث الفاتحہ: ۵ [۱:۴:۱(۳)] میں، "اِنَّا" (اِنَّ + نا = بیشک ہم) البقرہ: ۶ [۲:۵:۱] میں، "اِنْ" (اگر) البقرہ: ۲۳ [۲:۱۷:۱(۱)] میں، "شاء" (چاہا۔ ارادہ کیا) البقرہ: ۲۰ [۲:۱۵:۱(۸)] میں، اسم جلالت (اللہ) بحث بسم اللہ [۲:۵:۱] میں "لام مفتوحہ" (لَ) برائے تاکید البقرہ ۶۴ [۲:۴۱:۱(۶)] میں اور "مھتدون" (راستہ پانے والے) کو البقرہ: ۱۶ [۲:۱۴:۱(۷)] میں دیکھ لیجئے۔

● اس طرح اس عبارت کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "اور بے شک ہم اگر چاہا اللہ نے (تو) ضرور (ہیں۔ ہوں گے) راستہ پانے والے"۔ تقریباً تمام ہی مترجمین نے یہاں اسم "مھتدون" کا ترجمہ فعل مضارع (بمعنی مستقبل) کے ساتھ کیا ہے یعنی "اگر اللہ نے چاہا/ خدا چاہے تو/ ان شاء اللہ۔ ہم راہ پالیں گے، راہ پا جائیں گے، پتہ لگالیں گے، ٹھیک پتہ لگائیں گے" کی صورت میں۔ اور بعض نے مزید با محاورہ کرتے ہوئے "ٹھیک سمجھ جائیں گے اور (ہم کو) ٹھیک بات معلوم ہو جائے گی" سے ترجمہ کیا ہے۔ مفہوم اور معنی سب کا ایک ہی ہے۔ اور بلحاظ محاورۂ اردو ٹھیک بھی ہیں تاہم بلحاظ لفظ ان سب میں "مُهْتَدُوْن" کا ترجمہ "نَهْتَدِی" کی طرح کر لیا گیا ہے۔

[قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ] یہ پورا جملہ پہلے دو دفعہ گزر چکا ہے دیکھئے البقرہ: ۶۸ [۲:۴۳:۱(۹)] کے بعد نیز البقرہ: ۶۹ [۲:۴۴:۱(۱)] کے بعد۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے "اس نے کہا بے شک وہ ہی کہتا ہے کہ بے شک وہ ایک گائے ہے (جو)"۔

۲:۴۴:۱(۷) [لَّا ذَلُوْلٌ] ابتدائی "لا" تو نافیہ (بمعنی "نہیں") ہے۔ یہاں اس سے اگلی عبارت میں "لا" کی تکرار کی وجہ سے اس پہلے "لَا" کا ترجمہ "نہ تو ہے" سے ہوگا یعنی "نہ تو وہ ایسی" ذَلُوْل "ہے جو کہ۔ اور یہ "جو کہ" کا مفہوم "ذَلُوْل" کے نکرہ موصوفہ ہونے سے پیدا ہوا ہے اور "ذلُوْل" کا مادہ "ذ ل ل" اور وزن "فَعُوْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "ذَلَّ يَذِلُّ ذُلًّا وَ ذِلَّةً" (ضرب سے) کے بنیادی معنی "آسانی سے قابو میں آجانا" ہیں اس سے اس میں "کمزور اور بے عزت ہونا" اور "مطیع ہونا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس

© rasailojaraid.com

فعل کے معانی واستعمال پر البقرہ: ۶۱ [۲:۳۹:۱(۱۴)] میں بات ہو چکی ہے۔

● زیرِ مطالعہ کلمہ "ذلولٌ" اس فعل مجرد سے اسم صفت (بصیغہ مبالغہ) ہے۔ جس کے معنی ہیں: "بآسانی قابو آنے والا" پھر اس سے "آسان، آسانی سے قابلِ استعمال، سدھایا ہوا، نرم اور باسہولت" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جانوروں میں سے "ذلول" وہ ہے جو کسی کام مثلاً سواری یا زراعت وغیرہ کے لیے سدھایا گیا ہو اور اس سے بآسانی کام لیا جا سکتا ہو مثلاً کہتے ہیں "بعیرٌ ذلولٌ" (سدھایا ہوا اونٹ)۔ راستوں میں سے "ذلول" (جیسے سبیلٌ ذلولٌ) اسے کہتے ہیں جسے کئی بار طے کیا ہو اور بکثرت استعمال ہوتا ہو۔ اور یہ لفظ (ذلول) مذکر مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے (بلکہ "فعول" کے وزن پر آنے والی تمام صفات (اسماءِ مبالغہ) مذکر مؤنث کے لیے یکساں ہوتی ہیں)۔ اوپر کی مثال میں "بعیرٌ" (مذکر) اور "سبیل" (مؤنث) ہر دو کے لیے صفت "ذلول" ہی آئی ہے اور اسی قاعدے کے تحت یہاں یہ صفت "بقرۃ" (گائے) کے لیے آئی ہے۔

● مندرجہ بالا معانی کی بنا پر مختلف مترجمین نے یہاں "ذَلُول" کا ترجمہ "محنت والی، محنت کرنے والی، کمیری، جس سے خدمت لی جاتی ہو" سے کیا ہے اور جن حضرات نے "بقرۃ" کا ترجمہ "بیل" کیا ہے انہوں نے "ذلول" کا ترجمہ "جوتا ہوا، ہل میں چلا ہوا، کام میں لگا ہوا" سے کیا ہے۔ اور شاید "گائے" کی بجائے "بیل" ترجمہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں مطلوب "بقرۃ" کے "ہل یا کنواں (جیسا آگے آ رہا ہے) نہ چلانے" سے متصف ہونا بیان ہوا ہے اور ہمارے ملک (کے بیشتر علاقوں) میں یہ کام گائے کی بجائے "بیل" سے ہی لیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض علاقوں میں گائے (بلکہ بارانی علاقوں میں "گدھی") کو بھی اس کام پر لگا دیا جاتا ہے۔

● لفظ "ذلول" قرآن کریم میں دو جگہ (البقرہ: ۷۱ اور الملک: ۱۵) آیا ہے اور ایک جگہ (النحل: ۶۹) اس کی جمع "ذُلُلٌ" وارد ہوئی ہے۔

۲:۴۴:۱(۸) [تُثِيرُ الْأَرْضَ] لفظ "الارض" (زمین) کی لغوی بحث پہلے البقرہ: ۱۱ [۲:۹:۱(۴)] میں گزر چکی ہے۔

"تُثِيرُ" کا مادہ "ث ور" اور وزن اصلی "تُفْعِلُ" ہے اصلی شکل "تُثْوِرُ" تھی اس قسم کے (اجوف کے) لفظوں میں اہلِ زبان حرفِ علت (جو یہاں "و" ہے) کی حرکت ماقبل حرف صحیح کو (جو یہاں "ث" ہے) دے کر حرف علت کو اس حرکت کے موافق حرف علت (یعنی فتحہ کے بعد الف کسرہ کے بعد یاء اور ضمہ کے بعد واو) میں بدل کر لکھتے اور بولتے ہیں یوں یہ لفظ تُثْوِرُ = تُثِوْرُ = تثیر ہو جاتا ہے۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

● اس مادہ سے فعل مجرد "ثَارَ یَثُورُ ثَوْرًا وَثَوْرَۃً" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں: "جوش میں آنا، بلند ہونا اور بکھر جانا"۔ اردو میں اس کا ترجمہ "اڑنا" کر سکتے ہیں مثلاً کہتے ہیں "ثَارَ الدُّخَانُ أَوِ الْغُبَارُ" (دھواں یا غبار اڑا/بلند ہوا) اسی طرح "ثَارَ الْمَاءُ" کے معنی ہیں: "پانی زور سے اچھل کر نکلا"۔ قرآن کریم میں اس مجرد فعل سے کوئی صیغۂ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ باب اِفعال سے فعل کے صرف دو صیغے (مضارع کے) چار جگہ آئے ہیں۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "تُثِیرُ" بھی اس مادہ سے باب افعال کا فعل مضارع صیغہ واحد مؤنث غائب ہے۔ باب اِفعال کے فعل "أَثَارَ ... یُثِیرُ (دراصل أَثْوَرَ یُثْوِرُ) إِثَارَۃً (بجائے اِثْوَار) کے معنی ہیں: .... "کو اٹھانا، جوش میں لانا، پھاڑنا، پھیلا دینا"۔ یہ فعل متعدی اور ہمیشہ مفعول بنفسہ کے ساتھ آتا ہے۔ اردو میں اس کا بامحاورہ ترجمہ مفعول کی مناسبت سے ہی کیا جا سکتا ہے مثلاً "أَثَارَ الْأَرْضَ" کا ترجمہ "زمین میں ہل چلانا" اور "أَثَارَ الْغُبَارَ" کا "گرد وغبار اڑانا" اور "أَثَارَ الْبَعِیرَ" کا مطلب "(بیٹھے ہوئے) اونٹ کو اٹھا دینا" ہوگا۔ اور اسی سے "أَثَارَ الْفِتْنَۃَ" "فتنہ وفساد برپا کرنا" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

● یہاں گزشتہ "لَا ذَلُولٌ" کے بعد "تُثِیرُ الْأَرْضَ" کا ترجمہ ہوگا "کہ (نہ تو) وہ زمین کو پھاڑتی ہے" یعنی ہل میں (نہیں) جوتی جاتی۔ اسی کا بامحاورہ ترجمہ کئی طرح کیا گیا ہے مثلاً "پھاڑے زمین کو، باہتی ہو زمین، جوتتی ہو زمین کو، کہ جس سے زمین جوتی جائے، کہ زمین جوتے، زمین کو جوتتی ہو" وغیرہ۔

۲:۴۴:۱(۹) [وَلَا تَسْقِی] "لا" نافیہ (بمعنی "نہیں"/"نہ") ہے اور "تَسْقِی" کا مادہ "س ق ی" اور وزن "تَفْعِلُ" ہے، یہ دراصل "تَسْقِیُ" تھا مگر اہل عرب اس قسم کے مضارع (ماقبل مکسور) کی آخری "ی" کو ساکن کر کے بولتے اور لکھتے ہیں یعنی تَسْقِیُ = تَسْقِی۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "سَقَی ...... یَسْقِی سَقْیًا (ضرب سے) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ..... "کو پانی پلانا"۔ پھر یہ فعل "کھیت وغیرہ کو پانی دینا، آبپاشی کرنا" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کبھی اس کا ایک مفعول بارش بھی ہوتی ہے مثلاً سَقَی اللّٰہُ فُلَانًا الْغَیْثَ (اللہ نے اس کے لیے بارش اتاری لفظاً = اس کو بارش پلائی۔

● اس فعل کے ہمیشہ دو مفعول ہوتے ہیں۔ جسے پلایا جائے اور جو چیز پلائی جائے اور دونوں ہی بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتے ہیں۔ پھر (۱) کبھی تو دونوں مذکور ہوتے ہیں جیسے "سَقَاهُمُ اللّٰہُ شَرَابًا طَهُورًا" (الدھر: ۲۱) "اللہ نے ان کو پاکیزہ مشروب پلایا"۔ اور کبھی (۲) دوسرا مفعول (پلائی جانے والی شے۔ پانی، دودھ وغیرہ) محذوف ہوتا ہے جیسے "وَیَسْقِینِ" (الشعراء: ۷۹) یعنی "وہ مجھے پلاتا ہے"۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

"کیا ہے" کا جواب محذوف ہے۔ اور (۳) کبھی دونوں مفعول محذوف ہوتے ہیں جیسے "وَيَسْقُوْنَ" (القصص: ۲۳) یعنی "وہ پلاتے ہیں/ پلا رہے ہیں" یہاں کس کو ہے کیا ؟ نہیں بتایا گیا اور (۴) فعل مجہول آئے تو پہلا مفعول تو نائب الفاعل ہو کر بصورت ضمیر مرفوع متصل آتا ہے اور دوسرا مفعول (اگر مذکور ہو تو) ظاہر اور منصوب ہوتا ہے جیسے "يُسْقَوْنَ (یعنی "هم") فيها كاسًا" (الدھر: ۱۷) یعنی 'وہ اس میں پیالہ (بھر کر) پلائے جائیں گے'۔

● قرآن کریم میں اس فعل (سقی یسقی) سے متعدد صیغے ۸ جگہ آئے ہیں۔ اور ۶ جگہ اس سے فعل بصورت مجہول آیا ہے جو مجرد سے بھی ہو سکتا ہے اور باب افعال سے بھی۔ کیونکہ باب افعال سے "أسقى يُسقي إسقاءً" کے معنی بھی سقی یسقی (مجرد) والے ہیں (یعنی "پلانا")۔ اور مجرد اور باب افعال دونوں کا مضارع مجہول "يُفْعَلُ" ہی ہوتا ہے۔ فعل مجرد کے علاوہ قرآن کریم میں اس مادہ سے مزید فیہ کے ابواب (افعال اور استفعال) سے بھی کچھ صیغے آٹھ جگہ ہی آئے ہیں۔ اور کچھ مصادر اور ماخوذ اسماء (سقاية، سُقيا وغیرہ) بھی ایک دو جگہ آئے ہیں۔

● "لا تسقي" اس فعل مجرد سے فعل مضارع منفی (بِلا) کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہے (فعل کی یہ تانیث بھی "گائے" والے معنی کی تائید کرتی ہے)۔ اس عبارت کا لفظی ترجمہ (بوجہ تکرار "لا") بنتا ہے: "اور نہ ہی وہ پانی پلاتی ہے" یعنی "آبپاشی بھی نہیں کرتی"۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ آبپاشی کے لیے (کنویں وغیرہ پر) استعمال نہیں ہوتی۔ اسی مفہوم کو بعض مترجمین نے "وہ پانی نہیں دیتی" سے ظاہر کیا ہے۔ فتح محمد جالندھری نے اس کا ترجمہ "اور نہ موٹھ چلاتی ہے" سے کیا ہے۔ کم از کم راقم الحروف کو تو یہ "ٹھیٹھ محاورہ" عربی سے بھی مشکل لگا ہے۔ ترجمہ میں "آبپاشی" کا لفظ آگے لفظ "حرث" (کھیتی) آنے کی مناسبت سے موزوں ہے۔ ویسے تو یہ بھی فارسی لفظ ہے تاہم قدرے عام فہم ضرور ہے۔

۲: ۴۴: ۱ (۱۰) [الْحَرْثُ] کا مادہ "ح ر ث" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "حرث يحرُث حَرْثًا" باب نصر اور ضرب سے آتا ہے۔ اگرچہ قرآن حکیم میں صرف "نصر" سے استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی "زرع" کی طرح ہیں یعنی "کھیتی کرنا، کاشت کرنا" کہتے ہیں "حرث الرجلُ" (آدمی نے کھیتی باڑی کی)۔ اور یہ فعل زمین میں "ہل چلانا" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: "حرث الأرضَ" (اس نے زمین کو کھیتی کے لیے کھودا/ الٹا پلٹا/ ہل چلایا)۔ اس کے علاوہ عام عربی استعمال میں یہ فعل بعض دیگر معانی مثلاً کمانا، کمائی کرنا، حرکت دینا، بات یاد رکھنا، خوب مطالعہ کرنا وغیرہ) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد کا صرف

© rasailojaraid
© rasailojaraid

ایک صیغۂ مضارع ایک جگہ (الواقعہ : ۶۳) باب نصر سے اور "کھیتی کرنا" والے معنی کے لیے ہی آیا ہے۔

● لفظ "حَرْث" اس فعل مجرد کا مصدر بمعنیٰ اسم ہے جس کا ترجمہ "کھیت یا کھیتی" ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ لفظ مختلف صورتوں (معرفہ نکرہ مفرد مرکب) میں قرآن کریم کے اندر ۱۳ جگہ آیا ہے۔ زیادہ تر تو یہ اپنے حقیقی معنی میں آیا ہے اور کہیں کہیں مجاز اور استعارہ کے طور پر۔ جیسے "حرث الدنیا" (دنیا کی کھیتی) اور "حرث الآخرۃ" (آخرت کی کھیتی)۔

● یہاں اس مکمل جملے "ولا تسقی الحرث" (جس کے اجزاء پر لغوی بحث اوپر [۲:۴۴:۱ (۹-۱۰)] میں گزری ہے) کا مجموعی لفظی ترجمہ بنتا ہے "اور نہ ہی وہ پانی پلاتی ہے کھیت کو"۔ اس کے مختلف بامحاورہ تراجم بھی اوپر بیان ہوئے ہیں۔ البتہ "لا" کی تکرار (لا ذلول .... ولا تسقی .... میں) کی وجہ سے اردو ترجمہ جس "ہی" کا تقاضا کرتا ہے اسے بیشتر مترجمین نے نظر انداز کیا ہے۔

© rasailojaraid

۲:۴۴:۱ (۱۱) "مُسَلَّمَةٌ" کا مادہ "س ل م" اور وزن "مُفَعَّلَةٌ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد "سلِم یسلَم سلامۃً وسلامًا" (سمع سے) کے معنی ہیں: "نجات پانا، سلامتی پانا (عیوب و آفات سے)"۔ یہ فعل لازم ہے۔ تاہم کبھی یہ باب نصر سے ایک دوسرے معنی کے لیے متعدی بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "سَلَمَتْهُ الحيَّةُ" اس کے معنی ہیں "اس کو سانپ نے ڈس لیا"۔ عربی میں نیک شگونی کے لیے "مار گزیدہ" (جسے سانپ ڈس لے) کو "سلِیم" بھی کہتے ہیں۔ تاہم قرآنِ کریم میں اس فعل مجرد سے کوئی صیغۂ فعل کسی بھی معنی کے لیے کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ بعض مصادر و مشتقات ۴۳ مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے بعض ابواب (تفعیل اور افعال) سے بکثرت افعال (۳۰ کے قریب جگہ) آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ کلمہ "مُسَلَّمَةٌ" اس مادہ سے باب تفعیل کا صیغہ اسم المفعول (یعنی برائے مؤنث) ہے۔ اور اس باب (تفعیل) سے فعل "سلَّم ... یُسلِّم تسلیمًا" عموماً صلہ کے بغیر متعدی بنفسہٖ استعمال ہوتا ہے اور اس کے کئی معنی ہوتے ہیں مثلاً (۱) "..... کو (آفات و عیوب سے) بچا لینا" کہتے ہیں "سَلَّمَهُ اللّٰهُ مِنْ ...." (اللہ نے اس کو ..... سے بچا لیا) (۲) "سلّم .... لِ / الی ...." کا مطلب ہے "..... کو ..... کے حوالے کر دیا" جیسے کہیں "سلَّم الشيءَ لهٗ والیه" (اس نے وہ چیز اس کو دے دی یا خاص اسی کے لیے کر دی) ان دو استعمالات میں بعض دفعہ مفعول اور جار مجرور یا صرف جار مجرور محذوف کر دیئے جاتے ہیں۔ جس کی مثال الانفال : ۴۳ اور البقرۃ : ۲۳۳ میں ہے۔

© rasailojaraid

(۳) کبھی یہ فعل لازم کی طرح "پوری طرح مطیع ہو جانا" یا "کسی فیصلہ کو دل و جان سے قبول کر لینا" کے معنی دیتا ہے جس کی مثال النساء: ۶۵ میں ہے۔ دراصل ایسے موقع پر بھی کچھ عبارت محذوف ہوتی ہے۔

(۴) "علیٰ" کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی "کو سلام کہنا" یا "۔ ۔ ۔ پر سلام بھیجنا" ہوتے ہیں یہ استعمال قرآن کریم میں تین جگہ آیا ہے بلکہ اس میں بھی ایک جگہ جار مجرور محذوف ہوا ہے۔

قرآنِ کریم میں اس فعل کے استعمال کے جن چھ مقامات کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان کی مزید وضاحت اپنے اپنے موقع پر ہو گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ عربی زبان میں فعل (سلَّم یسلِّم) بعض دیگر معانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو معاجم میں معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم یہ دوسرے معانی قرآن کریم میں نہیں آئے۔

● اس طرح لفظ "مُسَلَّمَة" کا لفظی ترجمہ ہے "بچائی ہوئی" (عیوب و آفات سے) اس لیے بعض نے اس کا ترجمہ "تندرست" بدن سے پوری، پورے بدن کی، صحیح سالم" سے کیا ہے (یعنی بیماری اور جسمانی عیب سے بچائی ہوئی)۔ اور بعض نے اس کا ترجمہ "بے عیب، سالم" (یعنی دوسرے رنگ کی آمیزش سے بچائی ہوئی) کیا ہے۔ جب کہ بعض نے "مُسَلَّمة" کا الگ ترجمہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ اگلی عبارت میں بیان کردہ صفت (لاشیة فیها) کا ہی ترجمہ کر دیا ہے (جو ہم ابھی آگے بیان کریں گے) اور جس میں دراصل "مسلَّمةٌ" (بچی ہوئی یا بچائی ہوئی) کا ترجمہ بھی ایک لحاظ سے شامل ہے (یعنی دھبہ یا داغ سے بچی ہوئی) تاہم ترجمہ میں نص کے ہر ایک لفظ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۲ : ۴۴ : ۱ (۱۲) [لَاشِیَةَ فِیْهَا] "لَا" (نہیں) اور "فِیْهَا" (فی + ها = اس میں) "شِیَةٌ" (جو یہاں منصوب ہے اس کے اعراب پر آگے بات ہو گی) کا مادہ "وش ی" اور وزنِ اصلی "فَعْلٌ" ہے۔ اس کی اصلی شکل "وَشْیٌ" تھی۔ پھر ابتدائی "و" گرا کر "ش" کو کسرہ (ـِ) دیتے اور آخر پر ابتدائی "و" کے عوض "ۃ" لگا دیتے ہیں (اس تبدیلی اور تعلیل پر مزید بات ابھی آگے فعل مجرد کے بیان میں ہو گی)۔ بعض نحوی کہتے ہیں[1] کہ یہ دراصل "وَشِیَةٌ" بروزن "فَعِلَةٌ" تھا پھر "و" گرا دی جیسے مضارع بھی "و" گرا کر "یَوْشِی" سے "یَشِی" بنتا ہے (اس کی وضاحت بھی آگے آ رہی ہے) یا دراصل لفظ "وِشْیَةٌ" بروزن "فِعْلَةٌ" تھا۔ "وَ" کو مضارع کی طرح گرا دیتے ہیں اور اس کی کسرہ (ـِ) "ش" کو منتقل کر دیتے ہیں۔ یوں یہ لفظ بصورت "شِیَةٌ" بروزن "عِلَةٌ" لکھا اور بولا جاتا ہے۔

● اس مادہ (وش ی) سے فعل مجرد "وَشَی" (الثوبَ) یَشِی وَشْیًا وَشِیَةً" (ضرب سے) آتا ہے اور

---

[1] ملاحظہ ہو اعراب القرآن للنحاس ۱: ۲۳۶۔ نیز مشکل اعراب القرآن للقیسی ۱: ۵۴۔

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

اس کے بنیادی معنی ہیں "(کپڑے کو) بیل بوٹے وغیرہ سے سجانا ' (کپڑے پر) بیل بوٹا نکالنا" یا "ایک رنگ (کے کپڑے) میں دوسرے رنگ (کے کپڑے کو) لگانا" یہ کام کرنے والے آدمی (فاعل) کو "واشی" اور کپڑے کو "مَوْشِيٌّ" کہتے ہیں۔ پھر استعارہ میں یہ فعل "چغلی کھانا" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "وَشَیَ بہ الی السلطانِ وَشْیًا وَشَایَۃً" (اس نے حاکم کے پاس اس کی چغلی کھائی)۔

اس فعل کا بنیادی مصدر تو "وَشْیٌ" ہے۔ تاہم مثال واوی (جس میں فاء کلمہ واو ہو) سے باب "ضرب" "فتح" اور "حسب" کے فعل مضارع میں ابتدائی "و" گرا دی جاتی ہے[1] (اسی لیے یہاں فعل کا مضارع "یَوْشِیُ" سے "یَشِیْ" ہو گیا ہے) مثال واوی کے ان ابواب کا مصدر اصلی حالت پر بھی رہتا ہے (جیسے یہاں "وَشْیٌ" ہو سکتا ہے) اور اہل زبان اس (مثال واوی کے مضارع) میں سے عموماً "و" کو نکال کر آخر پر "ۃ" بڑھا دیتے ہیں اور "و" کو نکالنے کے بعد اس (مصدر) کے شروع کے حرف (یعنی عین کلمہ) کو کسرہ (ـِ) دیتے ہیں۔ البتہ باب فتح (یا سَمِعَ) کی صورت میں مصدر کے اس حرف (عین کلمہ) کو فتحہ (ـَ) اور کسرہ (ـِ) دونوں لگ سکتی ہیں۔ اسی قاعدے کے تحت وَعَدَ یَعِدُ کا مصدر وَعْدٌ کے علاوہ "عِدَۃٌ" بھی آتا ہے اسی طرح وَعَظَ یَعِظُ سے "وَعْظ" اور عِظَۃٌ آتا ہے اور وَھَبَ یَھَبُ سے وَھْبٌ کے علاوہ ھِبَۃٌ اور ھَبَۃٌ بھی آتے ہیں اور وَسِعَ یَسَعُ سے سِعَۃٌ اور سَعَۃٌ استعمال ہوتے ہیں۔

● قرآن کریم میں اس مادہ (وشی) سے کوئی فعل (مجرد نہ مزید فیہ) کہیں نہیں آیا بلکہ صرف یہی ایک لفظ (شِیَۃ) اسی ایک جگہ وارد ہوا ہے جو اس فعل (وَشَیَ یَشِیْ) کا ایک مصدر بھی ہے۔ اور بطورِ اسم "شِیَۃ" کے معنی کسی جانور میں ہر وہ رنگ ہے جو اس کے مجموعی رنگ سے مختلف ہو۔ زیادہ تر یہ کالے رنگ میں سفید دھبے یا سفید رنگ میں کالے داغ کے لیے استعمال ہوتا ہے (جیسے پنجابی میں "ڈب" اور ایسے جانور کو "ڈبہ" کہتے ہیں)۔ اس کی جمع "شِیَات" آتی ہے۔

● اس طرح "لاشِیَۃَ فِیْھَا" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "اس کے مجموعی رنگ (جس کا زرد ہونا بیان ہو چکا ہے) میں کسی اور رنگ کا نشان (تک) نہ ہو" اکثر مترجمین نے اس قسم کے (مخالف رنگ کے) نشان کو لفظ "مُسَلَّمَۃ" (صحیح سالم) کی روشنی میں عیب سمجھتے ہوئے اس کا ترجمہ "داغ اور دھبہ" سے کیا ہے یعنی "جس میں کوئی داغ / کسی قسم کا داغ دھبہ / کسی طرح کا داغ / دھبہ نہ ہو" بعض نے صرف "جو بڑے داغ

---

[1] باب سَمِعَ سے وَسِعَ یَسَعُ (پھیل جانا) اس قاعدے کا ایک استثناء ہے ورنہ عموماً اس باب کا مضارع اصلی حالت میں رہتا ہے جیسے وَجِلَ یَوْجَلُ (ڈرنا)۔

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

ہو" سے ترجمہ کیا ہے جو شاید زیادہ بامحاورہ ہے۔ (بہتر ہوگا اب آپ ایک دفعہ پھر سابقہ کلمہ "مُسَلَّمَة" کی لغوی بحث اور اس کے معانی پر نظر ڈال لیں [۲ : ۴۴ : ۱ (۱۱)] میں۔ دونوں عبارتوں کے باہمی تعلق پر "الاعراب" میں مزید بات ہو گی)۔

۲ : ۴۴ : ۱ (۱۳) [قَالُوا الْآنَ] ("الآن" یہاں سمجھانے کے لیے عام رسم وضبط کے ساتھ لکھا گیا ہے اس کے قرآنی رسم وضبط پر بحث "الرسم" و "الضبط" میں بات ہو گی) "قالوا" (انہوں نے کہا۔ وہ بولے) اس لفظ کے لغوی پہلو (مادہ، باب اور تعلیل وغیرہ) سے آپ اب بخوبی واقف ہو چکے ہوں گے ورنہ البقرہ: ۱۱ [۲ : ۹ : ۱ (۴)] میں دیکھ لیجئے۔

● "الآن": بلحاظ معنی و ترجمہ یہ لفظ بالکل آسان ہے کیونکہ اس کے صرف ایک ہی معنی ہیں جسے اردو میں "اب" یا "اس وقت" سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کے مادہ واشتقاق اس کے اعراب اور اس کے طریق استعمال کے بارے میں قدیم و جدید علمائے لغت و نحو میں بعض دلچسپ اختلافات ہیں۔ مبتدی کے لیے غیر ضروری ہونے کے باوجود اہل علم کی ضیافت طبع اور تسکین ذوق کے لیے ہم اس لفظ کے متعلق ان مباحث کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔

● اکثر اہل لغت کے نزدیک اس (الآن) کا مادہ "ای ن" ہے[۱]۔ اس کا وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعَلٌ" ہے۔ گویا دراصل یہ "اَیَنٌ" تھا پھر یائے متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل کر "آنٌ" ہو گیا۔ (اس کی مزید وضاحت آگے آرہی ہے)

● بعض نے اس کا مادہ "اون" بیان کیا ہے[۲]۔ اس صورت میں ازراہِ قیاس اس کی اصل صورت "اَوَنٌ" ہونی چاہیے جس میں واو متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل کر "آن" بن سکتا ہے۔ تاہم بعض نے اس کی اصل اسی مادہ (اون) سے ماخوذ ایک اور لفظ "اَوَانٌ" (بمعنی "کسی کام کا مناسب وقت") قرار دیا ہے (اس پر بھی مزید بحث آگے آرہی ہے)۔ ان کے مطابق "اَوان" کی "و" ماقبل مفتوح کے باعث الف میں بدلی تو لفظ "اٰانٌ" ہو گیا۔ پھر التقائے ساکنین (دو الف ہونے کی بنا پر) ایک الف گر گیا اور لفظ "آنٌ" بن گیا۔ یا پھر "اَوَانٌ" کی "و" گرا کر "آن" بنا لیا گیا[۳]۔ بہر حال اس لفظ (الآن) کے ان دونوں مادوں

---

[۱] مثلاً دیکھئے المفردات (راغب)، القاموس المحیط، المعجم الوسیط، البستان۔

[۲] مثلاً المنجد، القاموس العصری اور Hans Wehr۔ بعض نے اس کا "اون" سے ہونا بطور ایک قول کے (یعنی قیل کہہ کر) ذکر کیا ہے مثلاً دیکھئے مشکل اعراب القرآن (للقیسی) ۱: ۵۴۔ النحو الوافی ۲: ۲۶۴۔ نیز Lane (مادہ "اون")۔

[۳] دیکھئے معجم مفردات الاعلال والابدال فی القرآن الکریم (للخراط) ص ۴۱۔

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

(این اور اون) کے افعال سے معنوی تعلق اور اس کے (ایک) خاص طریقِ استعمال اور اعراب سے متعلق بعض امور کی تفصیل یوں ہے:

● یائی مادہ (ا ی ن) کی صورت میں فعل مجرد "آنَ یَئِیْنُ أَیْنًا" (ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: "(کسی کام کا) وقت آپہنچنا، (بلحاظ وقت) قریب آلگنا"۔ اسی فعل کے ایک معنی "تھک کر رہ جانا" بھی ہیں اور "اَیْنٌ" (جو اس فعل کا مصدر بھی ہے) کے معنی "وقت" بھی ہیں اور "تھکاوٹ" بھی۔ تاہم پہلے معنی (وقت والے) زیادہ مستعمل ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: "آنَ اَیْنُکَ" (تیرا وقت آپہنچا) گویا "آنٌ" (بمعنی وقت) ایک طرح سے "أَیْنٌ" ہی کی دوسری شکل ہے۔ بلکہ بعض نے اس کی تعلیل ہی یوں بیان کی ہے کہ "اَیْنٌ" کی "یاء" کو حرکت دے کر "أَیَنٌ" بنایا گیا۔ پھر یاء متحرکہ ماقبل مفتوح کو الف میں بدل کر "آنٌ" بنالیا گیا[1] (دیکھئے اوپر قولِ اول)

● یہ فعل "آنَ یَئِیْنُ" تو قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ اس کے ہم معنی (وقت آجانا کے لیے) ایک فعل "أَنَی یَأْنِی" (ضرب)، سے ایک صیغہ فعل قرآن کریم (الحدید: ۱۶) میں آیا ہے۔ بلکہ اسی مادہ (ا ن ی) اور اسی فعل (انی یانی) کے بعض دوسرے معانی سے ماخوذ الفاظ (آنٍ، إِنَاءٌ، آنَاءٌ، آنِیَۃٌ اور أَنّٰی وغیرہ) بھی قرآن کریم میں آئے ہیں۔ اس مادہ (ا ن ی) اور اس کے اِن الفاظ پر تو اپنی اپنی جگہ بات ہوگی یہاں اتنی بات قابل ذکر (اور دلچسپ بھی) ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہ دوسرا مادہ (ا ن ی) دراصل ہمارے زیر بحث مادہ (ا ی ن) کی ہی مقلوب (الٹی) شکل[2] ہے اس لیے دونوں سے فعل بھی بالکل ہم معنی آئے ہیں گویا پنجابی کے "چاقو" اور "قاچو" والی بات ہے۔ مختار الصحاح میں (ص ۳۶) ابن السکیت کے حوالے سے ایک شعر مذکور ہوا ہے جس میں یہ دونوں فعل ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ شعر یوں ہے ؎

أَلَمَّا یَئِیْنْ لِی أَنْ تُجَلّٰی عَمَایَتِی ۔۔۔ وَأُقْصِرَ عن لیلی بلی قد أنیٰ لیا

(ترجمہ: کیا ابھی تک میرے لیے وقت نہیں آیا کہ میرا اندھاپن روشن (دور) کردیا جائے اور میں "لیلیٰ" سے باز آجاؤں؟ کیوں نہیں اب تو میرے لیے (وہ) وقت آہی گیا ہے)۔

● واوی مادہ (ا و ن) سے فعل مجرد "آنَ یئُون أَوْنًا" (نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی "خوشحال ہونا، آرام کرنا" ہیں۔ یہ فعل "وقت آجانا" والے معنی کے لیے تو استعمال نہیں ہوتا۔ صرف اس کے مصدر "اَوْنٌ" کے متعدد معانی میں سے ایک "حِیْنٌ" (وقت) بھی ہے۔ تاہم "وقت"۔ بلکہ کسی کام

---

[1] معجم مفردات الاعلال (للخراط) ص ۴۰
[2] دیکھئے Lane مادہ این۔ نیز مختار الصحاح ص ۳۶۔

© rasailojaraid.com

کا مناسب وقت" کے لیے (اس مادہ سے ماخوذ) زیادہ مستعمل لفظ "أوانٌ" ہے۔ جس کی جمع "آوِنَةٌ" ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک زیر مطالعہ لفظ (الآن) کے "آن" کی اصل ہی (اوان) ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔

● عربی میں "أوانٌ" یا "ألأوانُ" (معرفہ) کا طریقِ استعمال زیر مطالعہ لفظ "ألآنَ" سے بالکل مختلف ہے۔ تاہم اس (اوان) کا "ألآنَ" (کے "آن") سے معنوی تعلق واضح کرنے کے لیے ہم پہلے "أوان" کے استعمال کی چند مثالیں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں؛ "قبلَ أوانِہ" (اپنے وقت سے پہلے)۔ "فی غیرِ أوانِہ" (غلط وقت پر بے وقت) "فات الأوانُ" (ٹھیک وقت تو ہاتھ سے نکل گیا)۔ "جاءَ أوانُ البردِ" (سردی کا وقت / موسم آگیا)۔ بلکہ اس کے ساتھ یائی فعل (آن یئین) کو بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً "آن الأوانُ" (ٹھیک وقت آپہنچا)۔

● قرآن کریم میں اس دوسرے مادہ (اون) سے کوئی اسم فعل یا حرف استعمال نہیں ہوا۔ عام عربی میں بھی اس مادہ سے بھی "وقت" کے زیادہ تر "أوان" ہی استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے یہاں اس (اوان) کے استعمال کی اتنی وضاحت اس لیے ضروری سمجھی کہ بعض نے "الآن" کو اسی (اوان) سے ماخوذ بلکہ اسی کی دوسری شکل قرار دیا ہے (جیسا کہ اوپر گزرا ہے) حالانکہ ان کا استعمال جدا جدا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات نے "الآن" کو یائی مادہ (ای ن) سے متعلق قرار دیا ہے (دیکھئے اوپر قول اوّل)۔

● لفظ "الآنَ" کے طریقِ استعمال کے بارے میں تمام قدیم "کتبِ لغت و نحو" میں یہی لکھا گیا ہے کہ:

① یہ لفظ ہمیشہ "ال" کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اور یہ "ال" لامِ تعریف نہیں کیونکہ عام معرف باللام الفاظ کے برعکس (جو بصورت "تنکیر" (نکرہ ہوتے وقت) اس "ال" (لامِ تعریف) سے محروم ہو جاتے ہیں) اس (الآن) کا "ال" کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا بلکہ "الذی" یا اسمِ جلالت (اللّٰہ) کی طرح یہ "ال" اس کا مستقل حصہ ہے۔

② یہ لفظ معرب نہیں بلکہ مبنی ہے اور مبنی بر فتحہ (ـَ) ہے۔ اس کے آخری "ن" پر ہمیشہ فتحہ (ـَ) ہی رہتی ہے۔ یعنی یہ لفظ ہر حالت میں "الآنَ" ہی رہتا ہے۔

نحوی اور لغوی حضرات کی ان دو تصریحات کے مطابق یہ لفظ نہ تو بصورت "الآنُ یا الآنِ" استعمال ہوتا ہے اور نہ ہی "آنٌ آناً آنٍ" کی شکل میں۔ (خیال رہے کہ اوپر جو ہم نے فعل "أنی یأنی" سے الرحمٰن: ۴۴ میں آنے والے اسم الفاعل "آنٍ" کا ذکر کیا ہے (بمعنی کھولتا پانی) وہ دراصل "آنِیٌ"

© rasailojaraid.com

ہے۔ جو اعرابی گردان میں "آنَ یَئینُ آیناً اَیْنٌ ہوتا ہے)۔ اس کا اس "این" مادے والے "آن" سے کوئی تعلق نہیں ہے)

● پھر نحوی حضرات نے اس لفظ (الآن) کے ساتھ "ال" کے لطور جزو لاینفک ہونے کے اسباب پر بڑی بحث کی ہے اور پھر فیصلہ یہ دیا ہے کہ یہ لفظ ہمیشہ بصورت "الآن" ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کا وزن ہی "الفعَلَ" ہے[1] اسی طرح اس (الآن) کے مبنی ہونے کی بھی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک (متنازعہ فیہ دلیل) یہ بھی ہے کہ اس میں اسم اشارہ (ہذا الوقت) کا مفہوم پایا جاتا ہے (اور اسمائے اشارہ مبنی ہوتے ہیں۔ گویا اس کی بعض مبنی اسماء سے "رشتہ داری" ہے)۔ اور اس کے مبنی بر فتحہ (ـَ) ہونے کی وجہ تو خیر اس کا ظرف ہونا ہے یعنی یہ ظرفیت کی بناء پر منصوب (استعمال) ہوتا ہے اور بعض ظروف (مثلاً ایانَ، اینَ، حیثُ وغیرہ) مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا "این ہم بچہ شتر است" کے مصداق اس کو بھی "پکا مبنی" سمجھ لیا گیا اور اس کا معرب (متصرف) ہونا "نوادرات" میں شمار کیا گیا ہے[2]۔

● "الآن" کے معنی ہیں "ماضی اور مستقبل کے درمیان موجودہ حاضر وقت" جسے اردو میں "اب" یا "اس وقت" سے ظاہر کیا جا سکتا ہے (جیسا کہ اوپر شروع میں بیان ہوا ہے) بعض نحوی حضرات نے تو "الآن" سے صرف اتنا "حاضر وقت" مراد لیا ہے جتنی دیر میں آپ یہ لفظ (الآن) بول سکتے ہیں[3]۔ حالانکہ خود قرآن کریم کے استعمال سے (جہاں یہ لفظ مختلف سیاق و سباق میں آٹھ جگہ آیا ہے) اس لفظ میں "قریب ترین ماضی" اور "قریب ترین مستقبل" کا مفہوم شامل ہونا معلوم ہوتا ہے۔

● یہ لفظ ایک طرح سے "الیومَ" (آج) کی طرح استعمال ہوتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ "الیوم" تو مطلقاً "دن" کے معنی میں مُعرَب بھی ہے اور نکرہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی حسبِ موقع "الیومُ۔ الیومِ، یومٌ، یوماً، یومٍ" استعمال ہو سکتا ہے مگر (نحوی حضرات کے بقول) یہ لفظ (الآن) "ال" کے بغیر کبھی استعمال نہیں ہوتا اور ہمیشہ مبنی بر فتحہ ہی رہتا ہے۔ حتیٰ کہ کسی حرف الجر کے ساتھ بھی "الآنَ" ہی رہتا ہے مثلاً کہیں گے: "حتی الآنَ" (اب تک) "الی الآنَ" (اب تک) "قبلَ الآنَ" (اب سے پہلے) "بعد

---

[1] اہلِ علم حضرات اپنے ذوق کی تسکین کے لیے چاہیں تو دیکھ لیں: البیان (لابن الانباری) ۱: ۹۵ - Lane (مادہ این)، البستان (مادہ این)، النحو الوافی ۲: ۲۶۴ نیز الخراط کی معجم مفردات الاعلال والابدال فی القرآن الکریم ص ۴۰-۴۱

[2] دیکھئے النحو الوافی ۲: ۲۵۰ [3] نفس المصدر ۲: ۲۶۳

© rasailojaraid.

الآن" (اب کے بعد) اور یہ استعمال قدیم وجدید معاجم میں مذکور ہے[1]

● نظریاتی مباحث میں نحوی بزرگوں کی مثال بعض دفعہ تو اس بھینس کی سی ہوتی ہے جو دریا میں اترنے کے بعد "پار" جانا بھول جاتی ہے بلکہ پانی میں کھیلتی مزے لیتی بہاؤ کا رُخ اختیار کر لیتی ہے اور بڑی دیر کے بعد اسے کنارہ یاد آتا ہے اس لفظ (الآن) کے مبنی ہونے کے بارے میں (متنازعہ فیہ) دلائل کے انبار لگا دینے کے باوجود بعض اہلِ علم (مثلاً السیوطیؒ) نے اس کا معرب ہونا تسلیم کیا ہے اور اسی رائے کو النحو الوافی میں "آسان اور قابلِ اطمینان" قرار دیا گیا ہے[2]

اور کم از کم بصورتِ اضافت تو "ال" کو بھی اس سے الگ رکھتے ہیں اور اسے بطور معرب بھی استعمال کرتے ہیں (یعنی وہ مبنی بر فتحہ بھی نہیں رہتا) مثلاً راغب نے (المفردات میں) سیبویہ کے حوالے سے یہ جملہ (مادہ "این" کے تحت) لکھا ہے "الآنَ آنُكَ" (اب تیرا وقت ہے) اس فقرے میں "آنُكَ" بطور خبر مرفوع بصورتِ مضموم آیا ہے۔ اسی طرح "البستان" میں ہے "آن أینُك او آنُكَ ای حان حینُكَ" (تیرا وقت آپہنچا) یعنی "أینٌ" اور "آنٌ" دونوں معرب ہیں۔ بلکہ المعجم الوسیط (مادہ این) میں تو "اَلآنَ آنُكَ" (وقت تیرا وقت ہے) بھی لکھا ہے۔ اس میں بطور مبتدا و خبر (دونوں طرح) "آنٌ" مرفوع بصورت ضمہ (ـُـ) آخر (ن) ہے۔

● اسی طرح جدید معاجم (ڈکشنریوں) میں یہ لفظ بغیر "ال" (لام التعریف) اور بطور اسم معرب "آنٌ۔ آنًا۔ آنٍ" استعمال ہوا ہے اور اسے لغۃً فصیح کا استعمال ہی سمجھا گیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "فی آنٍ واحدٍ" (بیک وقت) "من آنٍ الی آخرَ" (کبھی کبھی۔ کسی کسی وقت) اور اسی مفہوم کے لیے "آنًا بعدَ آنٍ" بھی آتا ہے۔ اور "آنًا فآنًا" (تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد[3]) جیسے "وقتاً فوقتاً" ہے اور یہی ترکیب (آنًا فانًا) اردو میں بمعنی "فوراً ہی" استعمال ہوتی ہے۔ اسی طرح القاموس العصری میں ہے۔ "أوانٌ = آنٌ = حینٌ = زمَنٌ" یعنی یہ سب مطلق "وقت" کا مفہوم رکھتے ہیں البتہ ان میں سے صرف

---

[1] دیکھئے Lane (مادہ این) اور Hans Wehr (مادہ اون) جہاں یہ سب مثالیں بیان ہوئی ہیں بلکہ مؤخر الذکر نے "آنَئِذٍ" اور "آنَذاكَ" (ہر دو بمعنی تب، اس وقت یا اس دن) کا بھی ذکر کیا ہے جو "آنَ" منصوب بظرفیت اور مضاف کی جدید مثال ہے۔

[2] دیکھئے النحو الوافی ۲: ۲۶۴ مع حاشیہ

[3] دیکھئے Hans Wehr تحت مادہ "اون"۔ یہ تراکیب اور "آنٌ" کا بطور معرب اور نکرہ (بغیر ال) استعمال قدیم کتب لغت و نحو میں مذکور نہیں ہے۔

© rasailojaraid.c

"آنٌ" ہی ایسا لفظ ہے جو بصورت "الآن" یعنی "معرف باللام اور ظرف منصوب" ہو کر بمعنی "اب" "اس وقت" استعمال ہوتا ہے جیسے "الیومَ" بمعنی "آج' یہ دن" استعمال ہوتا ہے۔

● قرآنِ کریم میں "الآن" آٹھ جگہ آیا ہے اور ہر جگہ بغیر کسی حرف الجر کے (اصل صورت میں) بطور ظرف منصوب ہی آیا ہے۔ اور ہر جگہ اس کا اردو ترجمہ سب نے عموماً "اب" سے ہی کیا ہے

● "الآن" کے بارے میں یہ ساری بحث دراصل "الاعراب" سے ہی متعلق ہے اس لیے اسے وہیں لے جانا اور بیان کرنا چاہیے تھا تاہم چونکہ اس کا تعلق کسی جملے کی ترکیب سے نہیں بلکہ ایک لفظ کے معنی اور اس کے خاص قسم کے طریقِ استعمال سے ہے۔ اور چونکہ ہماری اس تالیف کا مقصد صرف قرآن کا ترجمہ سکھانا ہی نہیں بلکہ قرآنی کلمات کے حوالے سے عربی زبان کا سکھانا بھی ہے۔ اور ہمارا شعار ہے: "عربی سیکھئے۔ قرآن کے لیے قرآن کے ذریعے"۔ اس لیے ہم نے اس لفظ کے قدیم وجدید استعمال پر بات کی ہے۔ اور ضمناً آپ کو نحوی حضرات کی بحرِ علم میں شناوری (تیراکی) کی ایک جھلک بھی دکھا دی گئی ہے۔ اگرچہ اس کوشش میں ہم خود بھی بہاؤ کے رخ کافی دور تک بہہ گئے ہیں۔

۲:۴۴:۱(۱۴) [جِئْتَ بِالْحَقِّ] اس جملے میں سے لفظ "الحق" (ٹھیک بات، حق، سچ) کے بارے میں آپ البقرہ ۲۶: [۲:۱۹:۱(۶)] میں پڑھ چکے ہیں۔ "جئت" کا مادہ "ج ی ء" اور وزن اصلی "فَعَلْتَ" ہے۔ یہ دراصل "جَيَئْتَ" تھا۔ کسی اجوف مادہ سے (جیسے یہ ہے) فعل ماضی کے جن (آخری نو) صیغوں میں لام کلمہ ساکن ہوتا ہے تو اہلِ عرب وہاں حرفِ علت (و/ی) کو گرا دیتے ہیں اور باب "نصر یا کرم" کی صورت میں فاء کلمہ کو (جو یہاں "ج" ہے) ضمہ (ـُـ) اور باقی ابواب میں کسرہ (ـِـ) دے کر بولتے اور لکھتے ہیں گویا "جَيَئْتَ" = جَاءْتَ = جَئْتَ = جِئْتَ۔ اب اس کا وزن "فِلْتَ" رہ گیا ہے۔ (قال سے قُلْتَ اور کان سے کُنْتَ اسی قاعدے سے بنتا ہے)

● اس مادہ (جیئ) سے فعل مجرد "جاءَ يجيءُ (دراصل جَيَأَ يَجْيِئُ) مَجِيئاً" (ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں: آنا۔ آجانا " پھر اس سے یہ کبھی "واقع ہونا/ ہو جانا" کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں "جاءَ الامرُ" (بات واقع ہو گئی)۔ قرآن کریم میں "اذا/ لمّا جاء امرُنا" متعدد جگہ آیا ہے۔ یہ (جاء یجیئ) فعل تو لازم ہے مگر اس کے لیے مفعول استعمال ہوتا ہے۔ جیسے "ولقد جاءَ آلَ فرعونَ النذُرُ" (القمر:۴۱) یعنی آلِ فرعون کے پاس ڈرانے والے آئے۔ ایسے موقع پر عربی میں "جاء عندہ" کہنا بالکل غلط ہے۔ قرآن کریم میں یہ فعل منصوب ضمیروں کے ساتھ (جاءہ، جاءکم، جئتنا، جئتمونا وغیرہ) بکثرت استعمال ہوا ہے۔

© rasailojaraid.com

● اور اسی فعل (جاء یجیئُ) میں فعل متعدی کی طرح "کرنا" کے معنی بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں "جاء الامرَ" (اس نے (وہ) کام کیا۔ لفظاً "وہ اس کام کے پاس آیا") قرآن کریم میں ہے۔ "لقد جِئتَ شیئًا نکرًا" (الکہف: ۷۴) یعنی تو نے ایک بہت بُری / نامعقول بات کی / کام کیا"۔ ویسے اس فعل کے بنیادی معنی (آنا) کو "ب" سے (بمعنی لانا۔ لے آنا) متعدی بنایا جاتا ہے یعنی "جاءَ ب ....." کا مطلب ہوتا ہے "وہ ... کو لایا / لے آیا" اور پھر اسی سے اس کا مجہول "جِیئَ ب ....." بمعنی "... کو لایا گیا" استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے "وَجِیْئَ یومئذٍ بجھنّمَ" (الفجر: ۲۳) یعنی اس دن جہنم (دوزخ) کو لایا جائے گا"۔ اس ("بِ" کے ساتھ متعدی بنانا) استعمال میں وہ مفعول جس کے پاس کوئی چیز لائی جائے وہ مفعول بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے اور جو چیز لائی جائے اس پر "باء" (بِ) کا صلہ آتا ہے جیسے قرآن میں ہے "فلمّا جاء ھم بالبیّنات" (الصف: ۶) یعنی جب وہ لایا ان کے پاس واضح دلائل"۔ البتہ اس استعمال میں بعض دفعہ مفعول اول (جس کے پاس کچھ لایا جائے) محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو سیاق سے معلوم ہوتا ہے جیسے "وَلمّا جاءَ عیسٰی بالبیّنٰتِ" (الزخرف: ۶۳) "اور جب عیسیٰؑ واضح دلائل لائے"۔ یہاں کن کے پاس؟ غیر مذکور ہے۔ یہ فعل (جاء یجیئُ) قرآن میں کثیر الاستعمال ہے اور مذکورہ بالا تمام معانی کے لیے متعدد جگہ آیا ہے۔ ہر ایک استعمال کی وضاحت اپنے موقع پر آئے گی اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "جِئتَ" اس فعل سے فعل ماضی معروف کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے یعنی "تو آیا" مگر اس کے بعد "بالحق" ہے۔ یہ "ب" وہی تعدیہ (متعدی بنانا) والا صلہ ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ یوں "جِئتَ ب ....." کا مطلب ہے "تو لایا" اور پورے فقرے "جِئتَ بالحق" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے۔ "تو حق / سچ لے آیا"۔ اسی کا بامحاورہ ترجمہ "لایا تو سچ / ٹھیک بات / ٹھیک پتہ" سے کیا گیا ہے۔ بعض مترجمین نے احتراماً "تم / آپ لائے .." کیا ہے۔ جب کہ بعض نے "تو نے ٹھیک بات کہی، آپ نے پوری بات فرمائی، (اب) تم نے سب باتیں درست بتا دیں" سے ترجمہ کیا ہے جو سیاقِ قصہ اور محاورہ اردو کے لحاظ سے تو ٹھیک ہے تاہم یہ اصل نص (عبارت) سے ضرور ہٹ کر ہے۔

۲:۴۴:۱ (۱۵) [فَذَبَحُوْھَا] جو "فَ + ذبحوا + ھَا" ہے۔ فعل "ذَبَحُوْا" کے باب اور معنی (ذبح کرنا) وغیرہ پر ابھی اوپر البقرہ: ۶۷ [۲:۴۳:۱(۱)] میں مفصل بات ہوئی تھی۔ نیز دیکھئے البقرہ: ۴۹ [۲:۳۲:۱(۵)] "فذبحوھا" کا لفظی ترجمہ تو ہے "پس انہوں نے ذبح کیا اس کو" جس کی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

بامحاورہ صورت" غرض انہوں نے اسے ذبح کیا" ہے بعض نے صرف "اسے کاٹا" سے ترجمہ کیا ہے اور بعض نے "حلال کیا" سے۔ یہاں بھی مفعول کے لیے مؤنث ضمیر (ھا) "گائے" والے معنی (بجائے بیل) کی تائید کرتی ہے۔

[وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ] یہ پورا جملہ "وَ" (اور) + "ما" (نافیہ یعنی نہیں تھے) + "کادوا" (وہ قریب تھے کر) + "يَفْعَلُوْنَ" (وہ کریں یا کرتے ہیں) اس عبارت کے مذکورہ تمام اجزاء پر اس سے پہلے بات ہو چکی ہے۔ اور یہ سب الفاظ آسان بھی ہیں۔ قدرے مشکل یہاں فعل مقارب "کَادُوْا" ہے جس کا مادہ "ک و د" اور وزن "فَعَلُوْا" ہے یعنی "کَادُوْا" دراصل "کَوَدُوْا" سے بنا ہے۔ اس سے فعل "کاد یکادُ کَوْدًا" کے معنی اور طریقِ استعمال پر (کہ اس کے ساتھ فعل مضارع کس طرح استعمال ہوتا ہے) البقرہ: ۲۰ [۲:۱۵:۱:(۱)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

● اس طرح یہاں "وما کادوا یفعلون" کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "اور/ حالانکہ وہ نہیں ہوتے تھے قریب (کہ) وہ کریں" پھر اس کی بامحاورہ صورت "وہ نزدیک نہ تھے کہ کریں"، "لگتے نہ تھے کہ کریں گے/ کر لیں گے" ہے اور بعض نے مزید بامحاورہ کرتے ہوئے "کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے"، "(ایسا) کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے" کیا ہے۔ بعض نے "فذبحوھا" کی مناسبت سے "ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے" کیا ہے گویا "یفعلون" کی بجائے "یذبحون" کا ترجمہ کر دیا ہے۔ بعض نے "وہ ایسا کرنے والے نہ تھے" کیا ہے جو "وما کانوا فاعلین" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے بعض نے "ان سے توقع نہ تھی کہ کریں گے" اور "امید نہ تھی کہ کاٹیں گے" کے ساتھ بھی ترجمہ کیا ہے جو لفظ سے بھی ہٹ کر ہے اور فعل مقارب والے مفہوم (نفی یا اثباتِ مقاربت یعنی نزدیک ہونا/ نہ ہونا) سے بھی دور ہے۔ "ما کادُو" کا "لگتے نہ تھے، معلوم نہیں ہوتے تھے" والا ترجمہ زیادہ بہتر اور بامحاورہ بھی ہے۔ خیال رہے کہ یہاں ترجمہ میں "کہ" کا استعمال اردو محاورے کی بنا پر ہے اصل عبارت میں "أن" نہیں ہے۔ اور اس فعل (کاد یکاد) کے ساتھ "أن" (عموماً) استعمال بھی نہیں ہوتا۔

(جاری ہے)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

© rasailojaraid.com